تحقیق و تنقید

مولانا عبدالرحمٰن کیلانی

مُساواتِ مَرد و زن

(آخری قسط)

۵۱۔ عورت کی شہادت :

قرآنِ کریم میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۸۲ میں ایک مرد کے بجائے دو عورتوں کی شہادت کو قابلِ قبول قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی چونکہ عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھتی ہے، لہٰذا پرویز صاحب طاہرہ بیٹی کو دلاسہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت عورتوں کے ناقابلِ اعتماد یا ناقص العقل ہونے کی دلیل نہیں۔ بلکہ (ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق کے مطابق) اگر ایک دائرے (یعنی جزئیات کی کماحقہ تبیین) میں عورتیں مردوں سے پیچھے ہیں۔ تو دوسرے دائرے (یعنی انسانی تعلقات کے مسائل کے باب میں) مرد عورتوں سے پیچھے ہیں۔ ایک کے دائرے میں ایک کی کمی ہے تو دوسرے دائرے میں دوسرے کی (فضّلنا بعضکم علیٰ بعض[1]) معاشرہ میں ایک دوسرے کی کمی باہمی تعاون سے پوری ہو سکتی ہے۔"

(ایضاً صـ ۶۷)

اس اقتباس میں جہاں تک ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق کا تعلق ہے، یہ نہ ہمارے لیے حجت ہے نہ ہی اس کا جواب دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ البتہ اس تحقیق پر پرویز صاحب نے جو خود ساختہ آیت "فضّلنا بعضکم علیٰ بعض" فِٹ فرمائی ہے۔ اور نتیجہ یہ پیش کیا ہے کہ "بعض امور میں عورت افضل ہے اور بعض میں مرد"، تو اس کا جواب ہمیں قرآنِ کریم ہی سے مل جاتا ہے، اور وہ آیات درج ذیل ہیں :

۱۔ "اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ" (النساء: ۳۴)

"مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔"

---

[1] سنتِ رسول اللہ کو "خود ساختہ شریعت" سے مطعون کرنے والے اس "مفکرِ قرآن" کا اپنا یہ حال ہے کہ اس نے قرآن بھی نیا گھڑ لیا ہے۔ محولہ بالا الفاظ "پرویزی قرآن" میں ہوں تو ہوں، محمدی قرآنِ مجید میں تو کہیں بھی موجود نہیں! (ادارہ)

اور یہ تمام بحث اُوپر گزر چکی ہے۔

۲۔ "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (البقرۃ: ۲۲۸)

"اور مردوں کو عورتوں پر درجہ حاصل ہے۔"

۳۔ "نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ" (البقرۃ: ۲۲۳)

"عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔"

—— وغیرہ! تفصیل آخر میں دی گئی ہے۔

لہٰذا "فضّلنا بعضكم على بعضٍ"[1] کا مطلب یہی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر بالادستی حاصل ہے۔ اب اس "بعض علیٰ بعض" سے یہ نتیجہ حاصل کرنا کہ "کہیں مرد برتر ہیں تو کئی پہلو میں عورت" ڈاکٹر ہارڈنگ کی تحقیق یا پرویزی نظریہ تو کہلا سکتا ہے مگر قرآنی تصریحات اس کا ساتھ نہیں دیتیں۔

دوسرا نکتہ آپ نے یہ پیش فرمایا کہ:

"قرآن نے دو عورتوں کے سلسلہ میں یہ نہیں کہا کہ ان دونوں کی شہادت یکے بعد دیگرے لی جائے تاکہ وہ دو شہادتیں مل کر ایک مرد کی شہادت کے برابر ہو جائیں۔ کہا یہ ہے کہ اگر ایک کو گھبراہٹ کی وجہ سے کہیں اُلجھاؤ پیدا ہو جائے ("تضلّ" کا مفہوم بیان ہو رہا ہے۔ مؤلف) تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یعنی اگر شہادت دینے والی عورت کو گھبراہٹ لاحق نہ ہو تو دوسری عورت کی دخل اندازی کا موقعہ ہی نہ آئے گا اور اس اکیلی کی شہادت کافی قرار پائے گی۔" (ایضاً ص ۲۸)

اس اقتباس کی رُو سے پرویز صاحب نے ایک مرد کے عوض دو عورتوں کے عدالت میں حاضر ہونے تک کی بات کو درست تسلیم کر لیا ہے۔ اب حقوق کی بحث تو یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عورت کے حق کا دفاع کیا ہوا؟

رہی یہ بات کہ اگر ایک عورت گھبراتی نہیں تو دوسری کی شہادت کا موقعہ ہی نہ آئے گا اور پہلی کی شہادت مکمل سمجھی جائے گی۔ یہ بات بھی آپ کے اپنے بیان کے خلاف ہے اور وہ بیان یہ ہے کہ عورت کسی معاملہ کی جزئیات کو سمجھنے اور بیان کرنے میں قاصر ہوتی ہے۔ لہٰذا دونوں کا بیان عدالت میں ضروری ہوا۔ کہ اگر ایک عورت کچھ جزئیات

[1] یہ الفاظ محض بطورِ نقل ہیں۔

بتلانا بھول جائے تو دوسری کے بیانات سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ پھر جو نصابِ شہادت قرآن نے مقرر کر دیا ہے اس میں سے ایک عورت کو خارج کر دینا کیا قرآن کی تحریف نہیں ہے؟ اب اس تحریف کی مزید وضاحت بھی ملاحظہ فرما لیجئے ـــــ آگے چل کر فرماتے ہیں:

"لڑکیوں کی پرورش زیورات میں کی جائے تو وہ غیر مبین رہیں گی۔ اور اگر زیورِ تعلیم[1] سے آراستہ کر دیا جائے تو وہ غیر مبین نہیں رہیں گی۔ اس صورت میں دوسری عورت کو ساتھ کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ قرآن کے اس قسم کے احکام بعض شرائط کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں۔ جب وہ شرائط باقی نہ رہیں تو وہ احکام بھی نافذ العمل نہیں رہتے۔ جیسے جب پانی مل جائے تو تیمم کا حکم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔" (ایضاً ص ۶۸)

دیکھا آپ نے قیاس مع الفارق کی کیسی بدترین مثال پیش کی گئی ہے۔ تیمم کا حکم اس طرح ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کیا جا سکتا ہے۔ اصل حکم پانی سے وضو کرنا ہے۔ نہ کہ تیمم کرنا۔ تیمم رُخصت ہے حکم نہیں۔ آپ نے اس حکم کو بدل کر یوں فرمایا کہ اگر پانی مل جائے تو تیمم ساقط العمل ہو جاتا ہے۔

دُوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ وضو کے مسئلہ میں یہ استثناء تو مجبوری کی شکل میں ہے۔ لہٰذا قرآن نے اس کا وضاحت سے ذکر کر دیا۔ لیکن شہادت دینے کے معاملہ میں تعلیم یافتہ نہ ہونا کونسی مجبوری ہے، جو اس کے لیے استثناء تلاش کیا جائے؟ پھر اگر یہ ایسی ہی مجبوری تھی تو قرآن نے جیسے وضو کے مسئلہ میں پانی نہ ملنے کی صورت میں خود ہی تیمم کی رخصت دی ہے۔ اسی طرح اگر عورت تعلیم کے ذریعہ ایک شہادت سے مستثنیٰ ہو سکتی تھی تو قرآن نے اس کا ذکر کیوں نہ کیا؟

یہ ہے قرآن کے اس ادنیٰ طالب[2] علم کے اجتہاد کی مثال۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے

---

[1] دیکھا آپ نے دونوں قسم کے زیوروں میں کتنا فرق ہے۔ یہ دوسری قسم کا زیور اتنا طاقتور ہے کہ حدود اللہ پر اثر انداز ہو سکتا ہے جس کا اللہ میاں ذکر کرنا بھول گئے، لیکن پرویز صاحب کو یاد رہ گیا ـــ العیاذ باللہ!

[2] واضح رہے کہ پرویز صاحب نے قرآنی نظامِ ربوبیت، لغات القرآن، مطالب الفرقان وغیرہ سب کتابوں کے دیباچہ میں اپنے آپ کو قرآن کا "ادنیٰ طالب علم" لکھا ہے۔

کہ مرکزِ ملت، اُمتِ مسلمہ کے لیے شریعت سازی کے فرائض بجا لائے گا۔ اور بزعم خود پرویز صاحب مرکزِ ملت کی گدی پر براجمان رہے ہیں۔ جیسا کہ اس کی تفصیل "محدث" کے کئی مقامات پر زیرِ بحث آچکی ہے۔

۶۔ مذکر کے صیغے :

طاہرہ بیٹی نے اپنے باپ جناب پرویز صاحب سے سوال کیا کہ :

"قرآن میں جہاں کہیں مردوں اور عورتوں کو مشترکہ طور پر خطاب کیا گیا ہے (وہاں صیغہ جمع مذکر کا ہی استعمال ہوا ہے) تو اس سے خواہ مخواہ مردوں کی بالادستی کا تصور قائم ہو جاتا ہے ؟"

اس کے جواب میں آپ اپنی بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ صرف قرآن ہی کا معاملہ نہیں بلکہ ہر معاشرہ اور ہر زبان میں یہی دستور چلا آتا ہے۔ تم دیکھتی نہیں کہ جب کوئی مقرر کسی مجمع کو خطاب کرتا ہے تو پہلے ایک بار یہ کہہ لیتا ہے کہ "خواتین و حضرات"! پھر آگے سارے صیغے مذکر کے استعمال کرتا چلا جاتا ہے اس وقت تو تمہیں ایسا کبھی خیال نہیں آیا۔ لیکن قرآن میں "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" دیکھ کر تمہیں ایسا خیال کیوں آنے لگا ؟" (ایضاً از ص ۷۱ تا ص ۷۳ ملخصاً)

اب آپ، بیٹی کے سوال اور باپ کے جواب پر دوبارہ غور فرما کر بتلایئے کہ اس جواب سے بیٹی کے اس تصورِ کہتری کو اور زیادہ تقویت ملی یا وہ کچھ مطمئن ہو گئی ؟

۷۔ جنتی معاشرہ :

بیٹی کا سوال یہ ہے کہ :

"قرآن کی رو سے جنتی مردوں کو تو اچھی اچھی عورتیں ملیں گی۔ لیکن جنتی عورتوں کو کیا مرد بھی ملیں گے ؟" (ایضاً ص ۷۳)

ظاہر ہے کہ یہ سوال بھی اس احساسِ کہتری کی پیداوار ہے، جو مردوں کی بالادستی کو اجاگر کر رہا ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ بیٹی کے اس تصور کو سوال کی شکل دینے والے بھی والد صاحب خود ہی ہیں۔ جنہوں نے "حُوْرٌ عِیْن" کا ترجمہ "اچھی اچھی عورتیں" کر لیا ہے۔

"حُور" بمعنی "ایسی عورتیں جن کی آنکھوں کی پُتلی بہت سیاہ اور سفیدی بہت سفید ہو" اور "عین" بمعنی "ایسی عورتیں جن کی آنکھیں موٹی موٹی ہوں" اور یہ دونوں باتیں خوبصورتی کی علامت ہیں، اور یہ جنت ہی میں ہوں گی۔ اب پرویز صاحب نے ان الفاظ کا ترجمہ "اچھی اچھی عورتیں" کرکے بیٹی کو یوں مطمئن کیا کہ "فرض کرو جنت میں حامد کو عائشہ ملتی ہے تو کیا عائشہ کو حامد بطور خاوند نہ ملے گا؟" (ایضاً ص ۷۳) گویا عورتوں کو بھی یقیناً "اچھے اچھے مرد" مل جائیں گے۔

پھر جنت کا مفہوم یہ بیان فرماتے ہیں کہ:

"یہ جنت دنیا میں ہی مل جاتی ہے۔ جنت کی عورتوں کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ نگاہ نیچی رکھنے والی ہوں گی۔ اور یہاں بھی مومن عورتوں کو یہی حکم ہے۔ جنت کی عورتیں بھی اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی ہوں گی۔ یہاں بھی مومن عورتوں کو یہی حکم ہے۔ مزید برآں اصل بات خیالات کی ہم آہنگی ہے اور اسی وجہ سے مشرکوں سے نکاح حرام ہے۔ یہ باتیں حاصل ہو جائیں تو یہی دنیا دراصل جنتی معاشرہ بن جاتا ہے۔ جس میں اگر مردوں کو پاکیزہ عورتیں ملتی ہیں تو عورتوں کو بھی پاکیزہ مرد ہی ملتے ہیں۔ اب بتاؤ، طاہرہ! تمہارا وہ اعتراض کہاں باقی رہتا ہے؟" (ایضاً ص ۷۷ ملخصاً)

اب آپ ہی بتائیں کہ طاہرہ بیٹی کیا بتلائے؟

گویا پرویز صاحب، بعد از مرگ ملنے والی جنت کو اسی دنیا میں کھینچ لائے۔ اور یوں ثابت کر دکھایا ہے کہ اگر مردوں کو "اچھی اچھی عورتیں" ملیں گی تو عورتوں کو بھی "اچھے اچھے مرد" ہی ملیں گے۔ لہٰذا تمہارے حقوق مردوں کے برابر ہی ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں!

۸۔ تعددِ ازواج

تعددِ ازواج کے موضوع پر چونکہ "طلوعِ اسلام" کی طرف سے "قرآنی فیصلے" میں علیحدہ بھی مضمون شائع ہوا ہے۔ اور میں اس کا جواب بھی الگ لکھ چکا ہوں لہٰذا یہاں تکرار کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

۹۔ حقِ طلاق مرد کو ہے: شریعتِ اسلامیہ میں طلاق ایک مکروہ چیز ہے، اسی لیے

اللہ نے زوجین کے اختلاف کی صورت میں زوجین کے لیے ایک ایک "حکم" تجویز کرنے کا حکم دیا ہے۔ کہ وہ امکانی حد تک ان کے اختلاف دُور کردیں اور ان میں صلح صفائی کرادیں۔ تاہم اگر اختلافات دُور نہ ہوسکیں تو آخری حق طلاق مرد کو دیا گیا ہے، لیکن پرویز صاحب فرماتے ہیں:

"لیکن اگر ثالثی بورڈ کی کوششیں ناکام رہیں اور وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کی باہمی رفاقت ممکن نہیں، تو وہ اپنی رپورٹ عدالت کے سامنے پیش کریں گے (اور اگر انہی کو آخری فیصلہ کا اختیار ہوگا تو خود ہی فیصلہ کردیں گے) اس طرح معاہدہ (نکاح) فسخ ہوگا۔" (ایضاً ص ۹۷)

دیکھا آپ نے کہ اس مفکرِ قرآن نے بلا دلیل، مرد سے حق طلاق چھین کر عدالت کو تفویض کردیا ہے، یا پھر دوسری صورت یہ بتلائی ہے کہ اس حق طلاق میں میاں بیوی دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔

اب دیکھیے ان دونوں باتوں کی تردید کے لیے قرآن کی درج ذیل آیت کافی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ" (البقرۃ: ۲۳۰)

"پھر اگر وہ (شوہر) اس (عورت کو تیسری) طلاق دے دے تو اس کے بعد جب تک عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے، اس (پہلے شوہر پر) حلال نہ ہوگی۔"

دیکھیے اس آیت میں "طَلَّقَ" واحد مذکر غائب کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا طلاق دینے والی اتھارٹی نہ عدالت ہوسکتی ہے نہ معاشرہ اور نہ ہی بیوی کو اس معاملہ میں شریک بنایا جاسکتا ہے۔

یہ عدالت کا شوشہ اس لیے چھوڑا گیا ہے کہ اسلام نے عورت کو بھی خلع کا حق دیا ہے۔ لیکن یہ چونکہ عدالت کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے، لہٰذا مرد و عورت کے حقوق میں یکسانی پیدا کرنے کی خاطر عدالت کو اس میں لا گھسیڑا ہے۔ یا پھر مرد و عورت میں برابر کا حصہ دار قرار دینے سے، اس یکسانی کی کوشش کی جارہی ہے۔

۱۰۔ عدت صرف عورت کے لیے :

اس مسئلہ میں پرویز صاحب نے چھاتی پر پتھر رکھ کر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ :

"بس یہ ایک حق فائق ہے جو مردوں کو دیا گیا ہے یعنی مرد کے لیے عدت نہیں اور عورت کے لیے عدت ہے۔ عام اصول تو یہ ہے کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ" (۲/۲۲۸) جو حقوق مردوں کے عورتوں پر ہیں بالکل ویسے ہی حقوق عورتوں کے مردوں پر ہیں۔ لیکن عدت کے زمانے میں اس کا شوہر اس سے پھر شادی کر سکتا ہے "وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (ایضاً ص ۹)

اب یہ جو مرد کی فضیلت عورت پر ایک درجہ زیادہ ہے۔ اس ایک درجہ کے پرویز صاحب نے پھر دو درجے بنا لیے۔ ایک یہ کہ عورت پر عدت ہے اور مرد پر نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مرد عدت کے دوران اپنی مطلقہ بیوی سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور قابلِ ذکر کام یہ کیا کہ "لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" کو صرف عدت کے زمانہ کے ساتھ محصور کر دیا۔ کہ اس عدت کے زمانہ میں تو مرد کو عورت پر درجہ ہے۔ آگے پیچھے نہیں۔ اب دیکھئے کہ آیت کا تسلسل اس طرح ہے :

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرۃ : ۲۲۸)

"اور عورتوں کا حق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسے دستور کے مطابق (مردوں کا حق) عورتوں پر ہے، البتہ عورتوں پر مردوں کو فضیلت ہے۔"

اب یا تو یہ مان لیجئے کہ مرد و عورت کے حقوق کی برابری کا تعلق بھی محض زمانہ عدت سے ہے۔ زمانہ عدت میں تو ان کے حقوق برابر ہوتے ہیں۔ لیکن آگے پیچھے عام حالات میں برابر نہیں ہوتے۔ یا پھر یہ تسلیم کر لیجئے کہ عورتوں پر مردوں کو جو درجہ ہے وہ بھی صرف عدت کے زمانہ کے ساتھ مختص نہیں۔ بلکہ عام حالات میں بھی یہ فضیلت قائم اور استوار ہے۔ اور اس بات کے باوجود بھی کہ عورتوں کے حقوق مردوں پر اور مردوں کے حقوق عورتوں پر ایک جیسے ہی ہیں، مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے۔

۱۱۔ عورت کی فضیلت بواسطہ حق مہر:

پرویز صاحب اپنی بیٹی طاہرہ کو دلاسہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلام کے نزدیک زندگی کے تمام شعبوں میں مرد اور عورت دوش بدوش چلتے ہیں۔ لیکن نکاح کے معاملہ میں اس نے عورت کی حیثیت مرد سے اُونچی رکھی ہے۔ اس نے مرد سے کہا ہے کہ اگر وہ نکاح کرنا چاہتا ہے تو تنہا اپنے آپ کو عورت کے برابر نہ سمجھ لے اسے اپنے ساتھ کوئی تحفہ بھی دے تاکہ اس طرح اس کا وزن عورت کے برابر ہو سکے۔ اس کے پاس سنگ کو، جس سے مرد کے وزن کی کمی پوری ہوتی ہے، مہر کہتے ہیں۔ لہٰذا یہ مساوات یُوں بنتی ہے:

"مرد + مہر = عورت"

قرآن نے یہ کہیں نہیں کہا کہ نکاح کے وقت عورت اپنے ساتھ کچھ لے کر آئے۔ اس نے مرد سے کہا ہے کہ وہ اپنی قیمت کی کمی مہر سے پُوری کرے، اگر اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں تو وہ حضرت موسیٰ کی طرح آٹھ دس سال تک بیوی کے باپ کا آجر بن کر رہے۔"

(ایضاً ص ۱۴۴)

اب دیکھئے مرد کے ذمہ صرف حق مہر ہی نہیں بلکہ عورت کا نان و نفقہ یعنی قیام و طعام کے پُورے اخراجات بھی ہیں۔ اور یہ مہر اور نان و نفقہ کے اخراجات مرد کی فضیلت کے حق میں جاتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ" (النساء: ۳۴)

دوسری قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ خرچ کرنے والا یا رزق بہم پہنچانے والا، مرزوق سے ہمیشہ افضل ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر نکاح کی مساوات بنانا ہی ہے تو وہ یوں بنتی ہے:

"مرد = عورت + حق مہر + نان و نفقہ یا قیام و طعام و پوشاک کے اخراجات"

اب اس مساوات میں دیکھ لیجئے کہ کمی کدھر ہے اور فضیلت کدھر؟

رہا حضرت موسیٰؑ کا واقعہ، تو یہ شریعت کا قانون یا دستور نہیں، بلکہ اس سے اصل مقصد حضرت موسیٰؑ کی تربیت اور ان کی طبیعت کی سختی کو بکریوں کے ریوڑ چرانے سے

نرم کرنا تھا۔ اور یہ سب باتیں بذریعہ وحی خفی، حسبِ منشائے الٰہی طے پائیں۔ عام دستور یہی ہے کہ حق مہر کچھ نہ کچھ ہونا ضرور چاہیئے خواہ یہ ایک لوہے کا چھلا ہی کیوں نہ ہو۔ اور خواہ یہ نکاح کے وقت ادا کر دیا جائے یا بعد میں۔ حق مہر کی مالیت کا شریعت نے کوئی تعین نہیں کیا۔ اور یہ ہر ایک کی حیثیت کے مطابق ہی ہونا چاہیئے۔ حق مہر کے عوض آجر بن کر رہنے کی کوئی دوسری مثال آپ کو نہ مل سکے گی۔

۱۲۔ بچپن کی شادی :

پرویز صاحب بچپن کی شادی کو از روئے قرآن ناجائز قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دین کا فیصلہ یہ ہے کہ نکاح کی عمر ہی بلوغت کی عمر ہے۔ (۴/۶) یعنی بالغ ہونے سے پہلے لڑکی اور لڑکے کی شادی ہو ہی نہیں سکتی اور صرف بلوغت ہی شرط نہیں بلکہ نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں فریقین کی رضا و رغبت نہایت ضروری ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب یہ معاہدہ انتخاب اور رضامندی سے ہوگا، تو فریقین ایک دوسرے کے مزاج، افتاد، طبیعت، تعلیم و تربیت، ماحول، عادات و خصائل ہر بات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں گے۔ اگر ہماری خود ساختہ شریعت ہمارے لیے سند نہ بنتی تو ارشد اور صغیرہ کی شادی اس بارہ برس کی عمر میں ہو ہی نہیں سکتی۔" (ایضاً ص ۲۵۵)

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ خود ساختہ شریعت سے پرویز صاحب کی مراد احادیث ہیں۔ لہٰذا ہم پرویز صاحب کی منشاء کے مطابق قرآن ہی سے بچپن کی شادی کا جواز پیش کریں گے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُھُنَّ ثَلٰثَۃُ اَشْھُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُھُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَھُنَّ" (الطلاق: ۴)

"اور تمہاری مطلقہ عورتیں، جو حیض سے ناامید ہو چکی ہوں، اگر تمہیں (ان کی عدت کے بارے میں) شک ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے۔ اور ان کی بھی جنہیں ابھی حیض شروع ہی نہیں ہوا۔ اور حمل والی عورتوں کی عدت وضع حمل

تک ہے۔"

اب دیکھئے آیتِ بالا میں بوڑھی، جوان اور بچی سب طرح کی عورتوں کا ذکر ہے۔ بوڑھی اور بچی کی عدت تین ماہ ہے اور جوان (یعنی بالغ جو قابلِ اولاد ہو) کی عدت اگر اسے حمل ہے تو وضع حمل تک ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ عدت کا سوال طلاق کے بعد ہی پیدا ہو سکتا ہے اور طلاق کا نکاح کے بعد۔ گویا نابالغ کا نکاح بھی از روئے قرآن جائز ہے۔

۱۳۔ عورت اور ولایت:

اس آیت سے دوسرا نتیجہ حقِ ولایت کا بھی نکلتا ہے۔ یعنی نابالغ لڑکے یا لڑکی کا والد اس بچے کی طرف سے انتخاب کا حق رکھتا ہے اور اس کا نکاح کر سکتا ہے۔ لہٰذا ارشد اور صغیرہ کی شادی "قرآن کی رُو سے درست تھی اور اس میں خود ساختہ شریعت کا بھی کچھ دخل نہ تھا۔ اس کے علی الرغم پرویز صاحب کا فتویٰ یہ ہے کہ:

"چونکہ کم سنی میں نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نکاح کے لیے ولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" (ایضاً ص ۲۸۲)

اور تیسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ کم از کم عورت کے لیے ولایت شرط ہے۔ کیونکہ آیت مذکورہ بالا میں بچیوں کے نکاح، طلاق اور عدت کا ذکر ہے۔ اور کنواری لڑکی کے لیے خواہ وہ بالغ ہو چکی ہو، ولایت کی شرط اس لحاظ سے بھی ضروری ہے کہ نکاح کے سلسلہ میں اپنی رضامندی برملا ظاہر کرنے سے اس کی فطری شرم و حیا مانع ہوتی ہے۔

ان تصریحات سے بھی مرد کا عورت پر فوقیت کا پہلو ہی سامنے آتا ہے۔

مرد کی فوقیت کے چند دوسرے پہلو

اب ہم کچھ ایسے امور کا ذکر کریں گے، جن سے مرد کی فوقیت ثابت ہوتی ہے۔ اور ان میں سے اکثر قرآن میں مذکور ہیں، مگر پرویز صاحب نے ان سے تعرض نہیں فرمایا۔ اور وہ یہ ہیں:

۱۔ کوئی عورت نبیہ نہیں ہوئی:

قرآن میں ستائیس انبیاءؑ و رسلؑ کے نام مذکور ہیں اور یہ سب مرد ہیں۔ قرآن میں

یہ بھی مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بستی کی طرف ہر زمانہ میں نبی بھیجے۔ جن میں سے بیشتر کا نام قرآن میں مذکور نہیں، لیکن قرآن میں کہیں خفیف سا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ کسی عورت کو بھی نبی بنا کر بھیجا گیا ہو۔

۲- کوئی عورت حاکم بھی نہیں بن سکتی:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ" (النساء: ۵۹)

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی فرمانبرداری کرو اور تم میں سے جو اربابِ حکومت ہیں ان کی بھی۔"

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ اُولِی الْاَمْرِ جمع مذکر کا صیغہ ہے، جس میں عورتیں بھی شامل ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ امکان بدیں صورت باقی نہیں رہتا کہ دورِ نبوی بلکہ قرونِ اولیٰ میں بھی کسی عورت کے حاکم یا افسر ہونے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

۳- عورتیں مردوں کی کھیتیاں ہیں:

"نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ" (البقرۃ: ۲۲۳)

"عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں!"

اس آیت کی جو توجیہ بھی کی جائے گی، اس سے مرد کی فوقیت ہی ثابت ہو گی۔

۴- نکاح کے بعد عورت ہی مرد کے گھر آتی ہے:

اس کی اصل وجہ تو یہ ہے کہ قیام کی ذمہ داری مرد کے سر ہے۔ تاہم اس سے بھی مرد کی فوقیت ظاہر ہوتی ہے۔

۵- اولاد کا وارث مرد ہوتا ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" (البقرۃ: ۲۳۳)

"اور ان عورتوں کی خوراک اور پوشاک باپ کے ذمہ ہے۔"

اس آیت میں "مَوْلُوْدٌ لَّهٗ" کا لفظ قابلِ غور ہے۔ جس سے صاف واضح ہے کہ مولود (لڑکا ہو یا لڑکی) کا وارث باپ (مَوْلُوْدٌ لَّهٗ) ہوتا ہے نہ کہ ماں۔

۶۔ تکمیلِ شہادت :

کسی بھی قضیہ اور متنازعہ امر کی شہادت خواہ وہ حدود سے تعلق رکھتا ہو یا تعزیرات سے یا نجی معاملات سے، مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس میں مردوں کی شمولیت نہ ہو۔ حدود کے قضایا میں عورت کی شہادت مقبول نہیں۔ لین دین کے معاملات میں بصورتِ مجبوری عورت کی شہادت مقبول ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ایک مرد کے عوض دو عورتیں ہوں۔ طلاق کا معاملہ جو خاص عورتوں سے متعلق ہے، اس میں بھی دو مردوں کی شہادت مقبول ہے۔ غرض کوئی قضیہ ایسا نہیں جو مرد کی شہادت کے بغیر پایۂ ثبوت کو پہنچ سکے۔ جبکہ تمام قضایا عورت کی شہادت کے بغیر بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتے ہیں۔

۷۔ اہلِ کتاب سے نکاح :

مرد تو کتابیہ عورت سے بوقتِ ضرورت نکاح کر سکتا ہے، لیکن عورت کو یہ اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ عند الضرورت کسی اہلِ کتاب سے نکاح کرے۔

یہاں ہم نے زندگی کے بیس گوشوں کا تذکرہ کیا ہے جبکہ استقصاء سے ان میں مزید اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ ان تمام گوشوں میں قرآنِ مجید سے مرد کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی مفکرِ قرآن ہر ہر بات میں مرد اور عورت میں یکسانی کی کوشش کرنے لگ جائے تو اسے قرآنی آیات کی تاویل میں جتنی ذہنی کاوش کرنی پڑے گی اور جیسی کچھ وہ تاویلات ہو سکتی ہیں، وہ ظاہر ہے۔

ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ مذکورہ بالا تمام تر گوشوں میں عورت کا اپنا قصور نہیں۔ کیونکہ ایسے معاملات میں شریعت نے اسے اس کی جسمانی ساخت اور جبلی فطرت کے لحاظ سے مجبور و معذور سمجھا ہے۔ پھر کچھ امور کا تعلق شرعی مصالح سے بھی ہے۔ لہٰذا ان نکات کے باوجود بھی عورت کو کمتر درجہ کی مخلوق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بہت سے معاملات میں عورت کو شریعت نے مرد کے برابر بھی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت پھر بھی باقی رہ جاتی ہے کہ ایک آدمی ایک کام نہیں کر سکتا، اور دوسرا وہ کام کر سکتا ہے اور پھر اسے احسن طریقے سے سرانجام بھی دیتا ہے، تو دوسرے کو پہلے سے بہرحال افضل سمجھا جائے گا۔

عورت کی برتری :

پھر کچھ امور ایسے بھی ہیں جن میں عورت کا درجہ مرد سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس بات کے باوجود کہ باپ اپنی اولاد کا جائز وارث ہے، اولاد کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت باپ سے زیادہ کرے۔ بلکہ یہ ماں کی خدمت کا حق باپ سے تین گنا زیادہ ہے۔ اس طرح عورت ہر مرد کے لیے قابلِ احترام ہستی ہے۔ اور اس کا فرض ہے کہ مشکل وقت میں عورتوں کی تکالیف کا لحاظ رکھے۔ لیکن یہ باتیں منکرینِ حدیث قسم کے لوگوں کے کام کی نہیں ہیں۔ ہم ان باتوں کا ذکر اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر ہم عورت کو بعض امور میں مرد سے فروتر سمجھتے ہیں تو بعض دوسرے امور میں اسے مرد سے بالاتر بھی سمجھتے ہیں۔ کیونکہ ہماری پوری شریعت نے ہمیں یہی کچھ بتلایا ہے جس میں ہم کسی طرح کی تاویل کے قائل نہیں۔

شعروادب

مولانا عبدالرحمان عاجزؔ

محبت کی امیں نوکِ سناں ہے

نہ ساحل ہے نہ ساحل کا نشاں ہے — محبت ایک بحرِ بے کراں ہے
درخشاں جس سے تاریخِ جہاں ہے — شہیدانِ وفا کی داستاں ہے
بلند از رتبۂ ہفت آسماں ہے — وہ دل جس میں تری الفت نہاں ہے
محبت مٹ نہیں سکتی جہاں سے — محبت کی امیں نوکِ سناں ہے
سنبھل کر جادۂ الفت پہ چلنا — یہاں کا ہر قدم اک امتحاں ہے
جگر شق، دل حزیں، نمناک آنکھیں — یہی تو زادِ راہِ عاشقاں ہے
اگر معلوم ہے رسمِ محبت — تو پھر کیوں شکوۂ دردِ نہاں ہے
جہاں گر کر کوئی مشکل سے اٹھا — جہنم زار وہ کوئے بتاں ہے
محبت ہے بس اللہ کی محبت — صلہ جس کا سکونِ دو جہاں ہے
ہمیشہ سرنگوں دیکھا ہے اس کو — مآلِ معصیت جس پر عیاں ہے

کسے رودادِ غم عاجزؔ سنائیں
جہاں میں کون ہے جو شادماں ہے